فلسفہ احکامِ میراث

محمد اسماعیل*

ABSTRACT:

This research article explores the rationale behind Islamic injunctions regarding inheritance. Unlike other Islamic injunctions, which are briefly enunciated in the Quran but elaborated in Sunnah, inheritance has been detailed in considerable length in the Quranic text itself. This coupled with numerous Prophetic traditions underpins the unique importance Islam accords to the question of inheritance. However, despite its exceptional importance, the subject of Islamic law of inheritance remains mostly a neglected one, even among the students of Islamic seminaries and Ulema. Resultantly, Islam's brilliant system of inheritance is often not implemented by the adherents of Islam, much to the miseries and hardships of the legal heirs, especially the children and women. Thus these marginalized segments of society are deprived of their rights today just as they were treated before the advent of Islam.

This research brings home the fact that the divinely ordained Islamic injunctions of inheritance are based on sound rationale and justification in the best interest of humanity, and that the believers must adhere to these injunctions that are based on three key principles: proximity in relationship, need, and distribution of wealth. The paper explains in great length the types of relatives and legal heirs, the principles of distribution among them, the justification for such shares, and the limits imposed by Quran and Sunnah with regard to the right of the deceased, the heirs, relatives and the state. It also discusses some of the contentious issues in contemporary debate on Islam: an orphan grandson's title to inheritance, and the philosophy behind 2:1 inheritance distribution formula between son and daughter. In doing so, the author has not only relied on the main sources of Islamic jurisprudence viz.Quran and Sunnah, in addition to classical and modern Islamic scholarship but also sound argumentation and logical exposition.

Keywords: Inheritance, Injuctions, Islamic Inheritance, Rationale, Wealth, Distribution.

یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ میراث کا علم اللہ کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت رکھنے والا علم ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"علم میراث سیکھو، اور اسے لوگوں کو سکھاؤ، اس لیے کہ یہ آدھا علم ہے"۔(۱)

اس علم کو علم الفرائض کا نام بھی اسی وجہ سے دیا گیا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے، یا اس وجہ سے کہ اس میں ورثاء کے حصے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیے ہیں۔

علم میراث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ باقی تمام عبادات کو اللہ تعالیٰ نے اجمالاً بیان فرمایا

* ریسرچ اسکالر: کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی　　　برقی پتا: abuabdullah64@gmail.com
تاریخِ موصولہ: ۲۰۱۵/۵/۱۳ء

ہے، اوراس کی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث مبارکہ کے ذریعے بیان فرمائے ہیں۔ جیسے نماز کی فرضیت کا حکم تو اللہ نے دیا ہے، لیکن اس کی باقی تفصیلات احادیث میں بیان ہوئی ہیں، کہ اس کے اوقات کیا ہیں، فرض رکعات کتنے ہیں، سنت کتنے ہیں، واجب کتنے ہیں، نوافل کتنے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تفصیلی وضاحت بھی احادیث ہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ لفظ ''صلاۃ'' سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ پانچ نمازیں ہیں۔ اسی طرح زکاۃ کے بارے میں بھی فرضیت کا حکم تو قرآن نے دیا ہے، لیکن اس کا نصاب، اور مقدار زکاۃ سب تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں۔ رمضان کے مہینے میں روزوں کا قرآن سے صرف یہ حکم دیا کہ

> ''اے مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تا کہ تم تقویٰ دار بنو''۔(۲)

لیکن روزے کی باقی ساری تفصیلات احادیث میں مذکور ہیں۔ حج کے بارے میں اسی لیے آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

> ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کو یوم النحر میں اپنی سواری پر جمرہ عقبہ کو مارتے ہوئے دیکھا کہ آپؐ فرما رہے تھے ''مجھ سے حج کے احکام سیکھو، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میں اپنے اس حج کے بعد پھر حج کر سکوں گا''۔(۳)

لیکن اس کے برعکس میراث کے قانون کی پوری تفصیلات قرآن کریم نے خود بتائی ہیں، اور ذوی الفروض اور عصبات کے تمام حصوں کا تعین خود قرآن کریم نے کر دیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کا حصہ الگ الگ کر کے دیا ہے۔ اور قانونِ میراث کے ساری تفصیلات کو ان تین آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے:

> یوصیکم اللّٰہ في أولادکم للذکر مثلُ حظ الأنثیین، فإن کُنَّ نسآءً فوق اثنتین فلھن ثُلُثا ما ترك، وإن کانت واحدةً فلھا النصف، ولأبویه لکل واحدٍ منھما السُّدُسُ مما ترك، إن کان له ولد، فإن لم یکُن له ولدٌ وورثه أبواہ فلأمه الثُّلُثُ، فإن کان لہٓ إخوةٌ فلأمه السُّدُسُ من بعد وصیةٍ یوصي بھا أو دینٍ، اٰبآء کم وأبنآء کم لا تدرون أیھم أقرب لکم نفعا، فریضةً من اللّٰہ، إن اللّٰہ کان علیمًا حکیمًا(۱۱) ولکم نصف ما ترك أزواجکم إن لم یکن لھن ولد، فإن کان لھن ولدٌ فلکم الربُعُ مما ترکن من بعد وصیةٍ یوصین بھا أو دین، ولھن الرُّبُعُ مما ترکتم إن لم یکن لکم ولدٌ، فإن کان لکم ولدٌ فلھن الثُّمُنُ مما ترکتم من بعد وصیة توصون بھا أو دین، وإن

كَان رجُلٌ يورثُ كلالةً أوِ امرأةٌ ولَهٗ أخٌ أو أُختٌ فلكلِ واحدٍ منهما السُّدُسُ، فإن كانوا أكثر من ذٰلك فهم شركآء فى الثُّلُثُ، من بعد وصية يوصٰى بها أو دينٍ غير مُضارٍّ وصية من اللّٰه واللّٰه عليمٌ حليمٌ(۱۲)(۴)

يستفتونك قُلِ اللّٰه يُفتيكم في الكلالة، إن امرُءٌ هلك ليس له ولدٌ ولَهٗ أختٌ فلها نصف ما ترك، وهو يرثها إن لم يكن لها ولدٌ، فإن كانتا اثنتين فلهما الثُّلُثان مما ترك، وإن كانوا إخوةً رجالاً ونسآءً فللذكر مثلُ حظّ الأنثيين، يبين اللّٰه لكم أن تضلُّوا، واللّٰه بكُلِّ شيءٍ عليم(۱۷۶)(۵)

زمانہ جاہلیت میں وراثت صرف طاقتور مردوں کا حق ہوتا تھا یعنی عورتوں اور بچوں کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا، اس قانون کی بنیاد یہ تھی کہ جو جنگ نہیں لڑسکتا، وہ میراث میں حصہ نہیں لے سکتا۔ جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''ورثہ جاہلیت کے زمانہ میں صرف طاقتور مردوں کو ملا کرتا تھا، اور عورتوں کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے اس ظلم پر مبنی قانون کو باطل کردیا ''مردوں کا حصہ ہے اپنی کمائی سے، اور عورتوں کا حصہ ہے اپنی کمائی میں سے''۔(۶)

سنن النسائی الکبریٰ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے، اس حدیث کو الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ امام بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الإیمان میں، امام ابو عبداللہ الحاکم نے المستدرك على الصحيحين میں، ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی نے سنن الدارقطنی میں اور امام نسائی نے السنن الکبریٰ میں بھی نقل کیا ہے۔

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سیکھو، اور اسے لوگوں کو سیکھاؤ، علم سیکھو اور اسے لوگوں کو سیکھاؤ، میراث سیکھو اور اسے لوگوں کو سیکھاؤ، کیونکہ میں تم سے رخصت ہونے والا ہوں، اور بہت جلد وہ وقت آئے گا، کہ علم کم ہوجائے گا، حتّٰی کہ دو اشخاص کا میراث کے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوجائے گا، اور کوئی بھی نہیں ہوگا کہ ان کے درمیان صحیح فیصلہ کرسکے''۔(۷)

اسی طرح امام بیہقی رحمہ اللہ نے السنن الکبریٰ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے، اور یہی روایت دوسرے الفاظ میں المعجم الطبرانی میں بھی نقل ہوئی ہے۔

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ میراث کا علم سیکھو،

اور اسے دوسرے لوگوں کو سیکھاؤ، کیونکہ یہ آدھا علم ہے، اور یہ علم بھول جاتا ہے، اور میری اُمت میں سے سب سے پہلے اس علم کو واپس لیا جائے گا''۔(۸)

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علم میراث

علم الفرائض (میراث) کی اسی اہمیت کی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں اس کی بڑی اہمیت تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''لوگو! میراث کا علم سیکھو، اس لیے کہ یہ تمہارے دین کا حصہ ہے''(۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لوگو! میراث، حج اور طلاق کے احکام سیکھو، اس لیے کہ یہ تمہارے دین کا حصہ ہے''۔(۱۰)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جس نے سورۃ النساء کو پڑھا اور اُس نے حاجب اور محجوب کو سیکھا، تو گویا اُس نے میراث کا علم سیکھ لیا''۔(۱۱)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اُس شخص کی مثال جو قرآن کا عالم ہو، مگر علم میراث کو اچھی طرح نہ جانتا ہو، ایسی ہے جیسے دونوں ہاتھ سر کے بغیر''(۱۲)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خصوصی شاگرد حضرت مسروق رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میراث کا علم جانتی تھی؟ تو حضرت مسروق رحمہ اللہ نے جواب میں فرمایا:

''ہاں! اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کبار صحابہ کو دیکھا تھا کہ وہ آکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے میراث کے مسائل پوچھا کرتے تھے''۔(۱۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گورنر مکہ نافع بن عبدالحارث سے ملاقات

صحیح مسلم، باب فضل من یقوم بالقرآن میں یہ واقعہ نقل ہوا ہے۔

''عامر بن واثلہ بیان کرتے ہیں کہ گورنرِ مکہ نافع بن عبدالحارث عسفان نامی مقام پر امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے آئے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین مدینہ منورہ سے عُسفان تشریف لائے تھے یا کسی سفر میں یہاں سے گزر رہے تھے، تو

گورنرِ مکہ کو ملاقات کے لیے بلایا ہوگا)۔ ملاقات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ اہل مکہ پر کس کو قائمقام گورنر بنا کر آئے ہو؟ اُس نے کہا، ابن ابزیٰ کو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ ابن ابزیٰ کون ہیں؟ نافع نے کہا یہ ہمارا آزاد کردہ غلام ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو تم نے اہل مکہ پر آزاد کردہ غلام کو گورنر بنایا؟ اس پر نافع بن عبد الحارث نے کہا: امیر المؤمنین! وہ اللہ کی کتاب (قرآن کریم) کے عالم ہیں، اور احکامِ میراث کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی لیے تو تمہارے نبیﷺ نے فرمایا'' اللہ اسی کتاب کے ذریعہ قوموں کو بلندی عطا فرماتا ہے، اور اسی کی وجہ سے لوگوں کو ذلیل کرتا ہے''۔(۱۴)

ان واقعات اور بیانات سے علمِ میراث کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ کہ ایک آزادہ کردہ غلام بھی اس علم کے نتیجے میں ولایت اور سرداری کا رُتبہ حاصل کر لیتا ہے، اگر چہ حسب ونسب وغیرہ میں وہ سب سے پیچھے کیوں نہ ہو۔ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مُصنّف بن ابی شیبہ میں حضرت سلیمان بن موسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے:

''جس نے کسی وارث کے میراث کا وہ حق باطل کردیا، جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ اُس کی جنت کے میراث کا حق باطل کردے گا''۔(۱۵)

امام بیہقی رحمہ اللہ نے السنن الکبریٰ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''جب تم کھیل کود کرنا چاہو تو تیراندازی کیا کرو اور جب بحث ومباحثہ (Table Talk) کرنا چاہو تو احکامِ میراث پر کیا کرو''۔(۱۶)

مستدرک حاکم میں ہے کہ یہ خط امیر المؤمنین نے بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا۔

ان تمام روایات سے علمِ میراث کی اہمیت خوب واضح ہوجاتی ہے، کہ اسلام میں علمِ میراث سیکھنا کتنا ضروری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں علمِ میراث عملاً بالکل ناپید ہوگیا ہے، حتّٰی کہ علماء تک اس علم سے اتنے غافل ہوگئے ہیں کہ انہوں نے سرے سے اس علم کو پڑھانا ہی چھوڑ دیا تھا، کہ بس یہ ایک ایسا علم ہے کہ اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کیونکر اس کو پڑھایا جائے؟ دینی مدارس کے درس نظامی میں ایک انتہائی معتبر اور محکم کتاب ''سراجی'' پڑھائی جاتی ہے، لیکن یہ ایسی حقیقت ہے جس سے اصحاب مدارس اور اصحابِ تدریس کو انکار نہیں ہے کہ طلبہ اس کتاب کو پڑھنے کی حد تک ضرور پڑھ لیتے ہیں، اور اس کا امتحان بھی پاس کرلیتے ہیں، حتّٰی کہ کچھ ضابطے بھی یاد کرلیتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک

ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان طلبہ کی اکثریت کو میراث کے احکام اور ورثاء پر ترکہ کی تقسیم کا طریقہ نہیں آتا۔ یہ بات یہاں رُکی نہیں بلکہ یہاں تک اب پہنچ گئی، کہ عام لوگوں میں میراث کو اس کے قانون کے مطابق شرعی ورثاء تک پہنچانا اور تقسیم کرنا ہی ختم ہوگیا ہے، اور اسلام کا قانونِ وراثت بس ایک تصوّر اور خواب سا رہ گیا ہے، جس کے لیے خارج میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

میراث کے علم سے بے خبری اور حد درجہ غفلت کا زیادہ بُرا اثر خواتین پر ہوا ہے، جس کے نتیجے میں بہنوں کو لوگوں نے میراث کا حصہ دینا ہی بند کردیا، اور بڑے اطمینان اور خوشی کے ساتھ بیٹھ کر باپ کا ترکہ آپس میں تقسیم کرتے ہیں، بہنیں موجود ہوتی ہیں، لیکن اُن کے دیکھتے دیکھتے، یعنی اُن کے سامنے اُن کا حصہ خود تقسیم کرتے ہیں، اور بہنیں اپنے باپ کی میراث سے عمر بھی کے لیے محروم ہوجاتی ہیں، اور ظاہر ہے اس ظلم کے نتیجے میں ان بہنوں کے بچے بچیاں بھی محروم ہی ہوجاتی ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف بہنیں اس ظلم کا شکار نہیں ہیں بلکہ بہت ساری بیوائیں اور یتیم بچیاں اور بچے بھی اس ظلم کا شکار ہیں کہ ان کا حصہ طاقتور مرد ورثاء ہڑپ کرجاتے ہیں، یہ بالکل جاہلیت کے زمانے کی وہ شکل ہے، جیسے اُس وقت مرد اور پھر طاقتور مرد کو میراث کا حق پہنچتا تھا، جبکہ عورتوں اور بچوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، بالکل اسی طرح آج ہمارے معاشرے میں بھی عورتیں تو مکمل محروم ہوگئیں ہیں، لیکن ساتھ کمزور مرد یعنی بچپن میں یتیم ہونے والے بچے بھی اُن کے میراث کے حق سے محروم کردیے جاتے ہیں، اور وہ تمام اموالِ منقولہ اور غیر منقولہ جو اُن بچوں کے حصے میں آتے تھے، وہ سب یا تو آپس میں تقسیم کرکے بالکل کالعدم کردیتے ہیں، گویا وہ بچہ ان کے خاندان کا ہے ہی نہیں، اور نہ کبھی تھا۔ اور یا یتیم کا مال بچپن ہی میں اُس پر خرچ کے نام سے خود ہڑپ کرجاتے ہیں، اور بڑا ہوکر اُس بے چارے کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میرا بھی کوئی مال تھا۔

پوتے کی وراثت کے مسئلے پر چونکہ اسلام کے خلاف ان دشمنانِ اسلام کو ایک بے حقیقت اور فرضی شوشہ ہاتھ آگیا، تو اس پر انہوں نے بڑا شور مچایا، لیکن مسئلہ تو صرف یتیم پوتے کا نہیں، پوتیوں کا بھی ہے، اور اُن یتیم بچوں اور بچیوں کا بھی ہے، اور ان بچوں اور بچیوں کی بیوہ ماں کا بھی ہے، جسے کچھ بھی نہیں ملتا، بلکہ ستم پر ستم یہ کہ اُس بیوہ کو تو یہ لوگ عدّت گزرنے کے بعد بھی ایسے رکھتے ہیں، جیسے یہ اِن کے بھائی کے نکاح سے نکل کر خود بخود ان کے نکاح میں آگئی ہے۔ اُس کو دوسرے نکاح کا بھی حق نہیں دیتے، اور اسے اپنی ناک کا مسئلہ سمجھتے ہیں، اور اس بیوہ کے یتیم بچوں، بچیوں کو اپنی میراث سمجھ کر آپس میں بھیڑ بکریوں کی طرح تقسیم کردیتے ہیں، اور بعض دفعہ تو ایسے دردناک واقعات ہوئے ہیں، جن میں سے ایک آدھ واقعے کا میں خود بھی گواہ ہوں، کہ شوہر کی وفات کے چند دن بعد کسی بہانے یا ضرورت کے لیے اس بیوہ خاتون کو اپنے

بچوں سمیت اپنے والدین کے گھر بھیج دیا، اور واپسی پر اُس کے لیے اِس گھر کا دروازہ بند کر دیا، کہ دوبارہ اب وہ اس گھر میں قدم ہی نہیں رکھ سکتی۔

تقسیم میراث کا فلسفہ

للرجال نصيب مما ترك الوالدان والأقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والأقربون مما قل منه أو كثر نصيبا مفروضا۔

اس آیت کریمہ میں پانچ بنیادی مسائل کا بیان ہے:

۱- میراث ضرور تقسیم ہونی چاہیے خواہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔

۲- میراث میں صرف مَردوں کا حصہ نہیں بلکہ عورتوں کا بھی حصہ ہے۔

۳- وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال پر لاگو ہوگا خواہ وہ اموالِ منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔

۴- میراث کا حق اُس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص مال چھوڑ مرے۔

۵- قریب ترین رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر محروم ہوگا۔علم میراث کے قانون کے اس دفعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ میراث کے قانون میں قائمقامی کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر قائمقامی کا سلسلہ شروع ہوجائے تو پھر ہر مردے کے قائمقام تقسیم میراث کے وقت حاضر ہوجائیں گے اور اپنے اپنے رشتہ دار کے قائم مقام بن جائیں گے، مثلاً سالے آئیں گے اور اپنے مردہ بہن کے قائمقام بن کر اُس کا حصہ وصول کرنے کا مطالبہ کریں گے۔ مرے ہوئے چھوٹے بچوں کی ماں اُن کا حق مانگنا شروع کر دیں گی، اور میراث میں زندہ ورثہ کو کچھ بھی نہیں ملے گا، بلکہ قائمقام سارا ترکہ لے جائیں گا، جس سے میراث کا قانون ایک پراگندہ اور غیر معقول قانون بن جائے گا۔

تقسیم میراث کے احکام شرعیہ کا فلسفہ تین بنیادی اصول پر مبنی ہے:

۱- قرابت یعنی رشتہ داری: پہلا حق قریبی رشتہ داروں کا ہے، تو میت کے قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار محروم ہونگے

۲- ضرورت: یعنی اللہ نے میراث کے حصے حسب ضرورت مقرر کئے ہیں تو لڑکوں کی ضرورت زیادہ ہے۔

اس لیے کہ لڑکیوں کا خرچہ والدین کی ذمہ داری ہے اور اُن پر کمانا لازم نہیں ہے اور شادی کے بعد شوہر پر نفقہ لازم ہے۔ اسی طرح عورت والد اور شوہر دونوں سے حصہ لیتی ہے اور نان نفقہ کی ذمہ داری اس پر کچھ بھی نہیں ہے۔

اسی طرح میت کی اولاد کی ضرورتیں اس کے والدین سے زیادہ ہوتی ہیں اس لیے میراث میں ان کا حصہ زیادہ

مقرر ہوا۔

۳- تقسیمِ دولت: اسلام نے ایسا انتظام کیا ہے کہ دولت خاندانوں میں تقسیم ہو جائے اور ایک ہاتھ میں جمع نہ رہے۔یعنی ارتکاز دولت نہ ہو، جیسے قرآن نے فرمایا: ''تا کہ وہ (مال) تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے''۔(۱۷)

اسی غرض کے لیے تقسیم میراث کا قانون دیا''فھو العلیم الحکیم''

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مولانا سید ابوالأعلیٰ مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ قرآن مجید کی اہم ترین اصولی آیات میں سے ہے، جس میں اسلامی معاشرے اور حکومت کی معاشی پالیسی کا یہ بنیادی قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ مال صرف مالداروں ہی میں گھومتا رہے، یا امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں۔قرآن مجید میں اس پالیسی کو صرف بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کیا گیا ہے بلکہ اِسی مقصد کے لیے سود حرام کیا گیا ہے، زکاۃ فرض کی گئی ہے، اموالِ غنیمت میں سے خُمس نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، صدقاتِ نافلہ کی جگہ جگہ تلقین کی گئی ہے، مختلف قسم کے کفاروں کی ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں، جن سے دولت کے بہاؤ کا رُخ معاشرے کے غریب طبقات کی طرف پھیر دیا جائے، میراث کا ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ ہر مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائرے میں پھیل جائے، اخلاقی حیثیت سے بخل کو سخت قابلِ مذمّت اور فیاضی کو بہترین صفت قرار دیا گیا ہے، خوشحال طبقوں کو سمجھایا گیا ہے کہ اُن کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے، جسے خیرات نہیں بلکہ اُن کا حق سمجھ کر ہی ادا کرنا چاہیے، اور اسلامی حکومت کی آمدنی کے ایک بہت بڑے ذریعہ، یعنی فَے کے متعلق یہ قانون مقرر کر دیا گیا ہے، کہ اس کا ایک حصہ لازماً معاشرے کے غریب طبقات کو سہارا دینے کے لیے صرف کیا جائے۔''(۱۸)

کسی کے مر جانے کے بعد اس کا مال درج ذِیل ترتیب سے خرچ اور تقسیم کیا جائے گا۔

1- سب سے پہلے اس مال سے اس میت کے تکفین اور تدفین کا انتظام کیا جائے گا اور اس کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے گا، اس کی حکمت اور فلسفہ یہ ہے کہ ممکن ہے، مردے کے ورثاء اس کی تدفین کا خرچہ اپنے مال سے برداشت نہ کر رہے ہوں، اور اس کے مرتے ہی اس کا مال سارے کا سارا اُن ورثاء کے قبضے میں چلا گیا ہو، اور ورثاء کے علاوہ اور کوئی نہ ہو جو یہ خرچہ برداشت کرے، تو میت کے اپنے مال کے ہوتے ہوئے بھی اُس کی تکفین و تدفین کے مسائل پیدا ہونگے، اگرچہ یہ عمومی بات نہیں ہے، لیکن پھر بھی ایسی صورتیں پیش آ سکتی تھی، اس لیے اسلام نے یہ قانون دیا کہ مردے کی تکفین و تدفین کے سارے ضروری اخراجات مردے ہی کے مال سے ادا ہونگے، اس لیے اسلام نے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ تکفین اور تدفین میں غیر ضروری چیزیں شامل نہیں کی جا سکتیں مثلاً: کفن کا کپڑا ضرورت سے زیادہ خریدنا تا کہ ائمہ حضرات کو اس

میں سے حصہ دیا جائے یا جائے نماز خرید کر تقسیم کرنا۔ اسقاط اور صابن وگڑھ، یا کھانے اور حلوؤں کی دیگیں تقسیم کرنا جو بدعت بھی ہے لیکن مردہ کے مال سے اس پر خرچ کرنا بہت زیادہ قبیح اور شنیع ہو جاتا ہے۔ اس کی ممانعت کی حکمت یہ ہے کہ یہ چونکہ انسانی فطرت ہے کہ جب کسی کے گھر میں کوئی مر جائے، تو وہ خود بھی کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا، چہ جائیکہ وہ دوسروں کو کھلانا شروع کر دے، اس لیے اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ تین دن تک مردے کے رشتہ دار اور پڑوسی سب اُس کے لیے اور اُس کے مہمانوں کے لیے اگر ہوں، کھانے پینے کا بندوبست کریں، اور خود بھی جا کر پس ماندگان کے ساتھ تعزیت کے لیے اُن کے پاس جا کر بیٹھیں، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ نے حکم دیا:

ترجمہ: ''جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرو، اس لیے کہ اُن پر غم آیا ہے، جس نے اُن کو کھانے سے بے پرواہ کر دیا ہے''۔(۱۹)

البتہ میت کی وصیت کے بعد اس کی قضا روزوں اور نمازوں کا فدیہ دینا ثابت ہے لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں جو مروج ہے۔ یہ تو بدعت ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے مر جانے کے بعد اُس کے چھوڑے ہوئے مال کو مالِ مفت دلِ بے رحم کے مصداق استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ چونکہ یہ مال اب اس مردے سے ورثاء کی طرف منتقل ہو گیا ہے، اور ورثاء میں بیوہ یا بیوائیں بھی ہیں، اسی طرح ممکن ہیں یتیم بھی موجود ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ ورثاء موجود ہی نہ ہوں، اس لیے موجود ورثاء یا بااختیار وارث کو اس مال کی حفاظت کرنی چاہیے، تاوقتیکہ یہ اپنے مالکوں کے حوالے ہو جائے، اس کے بعد وہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتے ہیں۔

حضرت حمدون قصار رحمہ اللہ کا ایک دوست بسترِ مرگ پر آخری سانسیں لے رہا تھا کچھ اور لوگ بھی موجود تھے، جونہی دوست نے آخری سانس لیا، آپ نے فوراً چراغ بجھا دیا۔ لوگوں نے پوچھا، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: اس وقت تک تو ہمارے دوست کا مال تھا لیکن اب اس چراغ کا تیل یتیموں کا مال اور ان کی امانت ہے اس لیے بجھا دیا۔

۳- دوسرے نمبر پر اس مال سے میت پر موجود قرضے ادا کئے جائیں گے بشرطیکہ میت نے موت سے پہلے خود وصیت کی یا اس قرض کا وثیقہ موجود ہو۔ یہ اس لیے کہ چونکہ قرض کے عوض یہاں جتنا مال موجود ہے وہ مردے کا مال ہے ہی نہیں، بلکہ اُس کی حیثیت امانت کی ہے، جو قرض خواہ کو ادا کر دی جائے گی۔ اس کی ایک حکمت یا فلسفہ یہ بھی ہے، کہ قرض کا معاملہ مردے کے ترکہ کے ساتھ متعلق کر دیا، تاکہ اگر مردے کے مال سے قرض پورا نہ ہو تو زندہ ورثاء پر یہ قرض ادا کرنا لازم نہیں ہے، بے شک ورثاء اگر اپنی مرضی سے ادا کرنا چاہے تو کوئی پابندی بھی نہیں ہے، لیکن اگر وہ ادا نہ کرنا چاہے تو کوئی اُن کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اور اگر پورا مال قرض میں ختم ہو گیا، تو قصہ ختم ہو گیا اور اگر مال قرض سے کم پڑ گیا تو پورے ترکہ کو قرض خواہوں کے قرضوں کے حساب سے تقسیم کیا جائے گا، اُس کی وصیت باطل ہو جائے گی، اور ورثاء محروم ہو جائیں گے، یعنی

گویا قرض خواہ اُس کے وارث بن گئے۔ ہاں اگر ورثاء اپنی مرضی سے پورا قرض یا اُس میں سے کسی کا کچھ حصہ ادا کرنا چاہے تو اُن کو اس احسان کا اجر ملے گا اور دوسری طرف مردے کا ذمہ بھی عنداللہ فارغ ہو جائے گا۔

یہ حکم، کہ قرض مردے ہی کے مال سے ادا ہوگا، اور ورثاء پر اس کی ادائیگی لازم نہیں ہے، اس کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی ورثاء پر لازم ہوتی، تو بے شمار لوگ قرض کے مدعی بن کر آجاتے اور ورثاء کو تنگ کرنا شروع کردیتے کہ میت پر ہمارا اتنا قرض تھا وہ ہمیں ادا کردو۔ اور عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ورثاء سے ناراض ہو اور وہ اُن کو تنگ کرنے کے لیے لوگوں کو قرض کے وثیقے دیدیں، کہ فلاں فلاں کا مجھ پر اتنا اتنا قرض ہے، اور ورثاء اس کو ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔ اس لیے شریعت نے ورثاء پر یہ ذمہ داری نہیں رکھی ہیں کہ وہ میت کے قرضے ادا کرتے رہیں۔ ہاں اگر یہ قرض کسی فیکٹری یا کاروباری ادارے کے وکیل کے طور پر اُس نے لیا ہے تو پھر وہ فیکٹری یا ادارہ اس قرض کی ادائیگی کا پابند ہوگا، اگرچہ وہ وکیل فوت ہوگیا ہو جس نے یہ قرض لیا تھا۔ کیونکہ یہ قرض اُس نے اپنے لیے نہیں لیا تھا بلکہ درحقیقت یہ قرض اس فیکٹری یا ادارے نے لیا ہے اور وہ قائم ہے۔

۳- تیسرے نمبر پر میت کی وصیت اس مال سے پوری کی جائے گی لیکن وصیت کے لیے شرائط ہیں جن کی پابندی ضروری ہوگی:

۱- یہ وصیت میت کے مال کے ایک تہائی حصے سے زیادہ نہ ہو، یعنی کوئی بھی شخص اپنے مال کے تیسرے حصے سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ضرور بالضرور ایک تہائی کی وصیت کرے۔ بلکہ یہ آخری حد ہے کہ اس سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا۔ اگر کسی نے ایک تہائی سے زیادہ وصیت کی تو اُس میں سے صرف ایک تہائی کو ادا کیا جائے گا، باقی ورثاء کے لیے رہ جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد کو فرمایا کہ تمہارا اپنی اولاد کو مالدار چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ وہ پھر لوگوں سے مانگتے پھریں۔

۲- یہ وصیت ناجائز نہ ہو، ناجائز وصیت پر عمل نہیں کیا جائے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں کوئی آدمی یا عورت ساٹھ سال اللہ کی اطاعت کرتے رہتے ہیں پھر موت کے وقت ضرر رسان وصیت کرتے ہیں جس کی وجہ سے دوزخ ان کے لیے واجب ہو جاتا ہے

اس میں یہ بات بھی ملحوظ نظر رکھنی چاہیے کہ وصیت میت نے خود کی ہو، جعلی وصیت قابل قبول نہ ہوگی، دنیا ایسی وصیت کبھی چل بھی سکتی ہے، لیکن اللہ کے حضور یہ وصیت قابل قبول نہ ہوگی۔

۳- وصیت ذوی الفروض کے لیے نہیں کی جاسکتی، آپ ﷺ نے فرمایا:

"إن اللّٰہ تعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقّہ فلا وصیة لوارث" (۲۰)

"اللہ تعالیٰ نے میراث کے ہر حقدار کو اس کا پورا حق دے دیا ہے اس لیے وارث کے لیے کوئی

وصیت جائز نہیں‘‘

ذوی الفروض وہ لوگ ہیں جن کے لیے قرآن میں حصے مقرر ہیں۔عصبات وہ لوگ ہیں جو ذوی الفروض سے بچا ہوا مال لیتے ہیں۔

فلسفہ ممانعتِ وصیت برائے ورثاء

چونکہ میراث کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے ایسے عدل کے ساتھ کی ہے، کہ اس میں کسی کا حق رہا نہیں، چھوٹے بڑے اور مرد وعورت سب کو اس کا پورا پورا حصہ مل گیا ہے، مذکورہ حدیث میں اس کی انتہائی اچھی وضاحت موجود ہے، یعنی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اُس کے مورث کے ترکہ میں اُس کا حق پورا پورا دے دیا ہے، اس لیے وارث کے لیے کسی اور وصیت کا حق کسی کو بھی نہیں ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسی تقسیم کر دی کہ اب کسی وارث کے لیے مزید کچھ دینے کی وصیت کی گنجائش ہی نہیں رہی، اور یہی وارث کے لیے وصیت کی ممانعت کا فلسفہ ہے، کہ میت کے ترکہ میں جو اُس کا حق بنتا تھا، وہ پورے کا پورا اُس کو مل چکا ہے اور اب اس میں کسی قسم کی کوئی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔اس عادلانہ تقسیم کے باوجود وارث کے لیے وصیت کرنا اللہ کے تقسیم پر عدم اعتماد اور عدم رضا مندی کے مترادف ہوگا۔حالانکہ اللہ تعالیٰ کی یہ تقسیم ایسی عدل اور حکمت پر مبنی تقسیم ہے کہ اس میں کسی مظلوم کا کوئی اعتراض، یا کسی کمزور کی کوئی شکایت نہیں رہی، اور نہ روئے زمین پر کسی اور دین کے لیے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی کی گنجائش رہی ہے۔

4- چوتھے نمبر پر ورثاء ہیں کہ بقیہ مال ورثاء میں اللہ کی طرف سے ان کے مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔

قرآن کریم کی سورۃ النساء کی تین آیات کریمہ جو اس مضمون کے شروع میں لکھی گئی ہیں، ان میں میراث کی تقسیم کا پورا بیان موجود ہے، اور علم میراث پر آج دنیا میں جتنی بڑی بڑی ضخیم کتابیں موجود ہیں، وہ انہی تین آیتوں کی تشریح و توضیح ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے کلام میں کتنی جامعیت ہے، کہ انتہائی مختصر بیان میں کتنی تفصیلی تقسیم اور پھر انتہائی عدل کے ساتھ ہر حق دار کو اپنا حق پہنچا کر کی ہے، اور یہ تقسیم ایسی زبردست طریقے پر کی گئی ہے کہ آج تک دنیا کے کسی نظام کے پاس اس جیسا نظام موجود نہیں ہے، بلکہ میراث کی تقسیم کا اگر دنیا میں کوئی نظام ہے تو وہ یہی قانون ہے، جسے قرآن نے بیان فرمایا ہے۔

چھ قسم کے ورثاء کی عدم محرومیت کا فلسفہ

وارثوں میں ۶ قسم کے لوگ کبھی بھی محروم نہیں ہونگے۔

۱-باپ　۲-ماں　۳-بیٹا　۴-بیٹی　۵-شوہر　۶-بیوی

اس کی حکمت اور فلسفہ یہ ہے کہ میراث کا قانون قُرب اور بُعد پر مبنی ہے، یعنی اگر کسی میت کے قریبی ورثاء موجود ہونگے تو دور کے ورثاء محروم ہوں گے، اور یہاں یہ چھ ورثاء ایسے ہیں، جن کی موجودگی میں یہی میت کے سب سے زیادہ

قریب ہیں، اوران سے زیادہ کوئی قریب نہیں ہے، یعنی میت اوران کے درمیان کوئی حاجب نہیں ہے، جس کی موجودگی میں ان میں سے کوئی محروم ہوجائے۔

اولاد سے چھ قسم کے لوگ مراد ہیں: ۱۔بیٹا ۲۔بیٹی ۳۔پوتا ۴۔پوتی ۵۔پڑپوتا ۶۔پڑپوتی

☆ میراث کے قانون میں ''اخوۃٌ سے مراددویادو سے زیادہ بھائی بہن دونوں مراد ہیں، خواہ وہ حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی۔

حقیقی بہن بھائی: جوماں باپ دونوں میں شریک ہوں، اس کوعینی بھائی بھی کہتے ہیں، اردو میں سگا بھائی کہتے ہیں۔

علاتی بہن بھائی: جوصرف باپ میں شریک ہوں اورانکی مائیں الگ ہو۔اردو میں اسے سوتیلا بھائی کہتے ہیں۔

اخیافی بہن بھائی: جوصرف ماں میں شریک ہوں اوران کے باپ الگ ہو۔

اخوۃٌ میں حقیقی، علاتی اوراخیافی سب کی شمولیت کا فلسفہ

اس کی حکمت اور فلسفہ یہ ہے کہ چونکہ اولاد اس شخص کی شمار کی جاتی ہے، جس سے وہ پیدا ہوئی، تو حقیقی بھائی بہن کی تو بات بالکل واضح ہے کہ ان کے ماں باپ دونوں ایک ہی ہیں، لیکن علاتی بہن بھائی کا چونکہ باپ شریک ہے، اس لیے وہ بھی ایک دوسرے سے میراث لیتے ہیں، لیکن حقیقی بہن بھائی چونکہ اقرب ہیں اس لیے اُن کی موجودگی میں علاتی محروم ہونگے، لیکن حقیقی بہن بھائی کی غیر موجودگی میں پھر علاتی بہن بھائی اپنا حصہ لیں گے، خواہ وہ ذوی الفروض کی حیثیت سے ہو یا عصبہ کی حیثیت سے، اسی طرح چونکہ اخیافی بہن بھائیوں کی ماں ایک ہے، اس لیے وہ اس ماں کے ترکہ میں یہ بہن بھائی سب شریک ہوں گے، باپ اگرچہ ایک نہ ہو، لیکن جہاں تک ماں کے ترکہ کا تعلق ہے، اُس میں اس ماں کے بطن سے پیداہونی والی ساری اولاد بطور اخیافی بہن بھائی اپنا مقررہ حصہ لیں گے۔

قانونِ میراث میں عاق کی کوئی حیثیت نہیں

میراث میں عاق کی کوئی حیثیت نہیں، مورث کے مرنے کے بعد وہ اپنا مقرر حصہ ضرور لے گا اس لیے کہ یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس لیے کہ میراث کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی ہے، اور اُس کے فیصلوں کو کوئی بھی تبدیل نہیں کرسکتا، خواہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔ تو جس کو اللہ نے قرآن کریم میں حصہ دیا ہے، کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ حصہ اُس سے واپس لے لے۔ اس لیے آج کل عدالتوں میں جو عاقنامہ بنتا ہے، شرعی لحاظ سے اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور نہ اُس پر عمل کیا جائے گا۔ البتہ اپنی زندگی میں اگر باپ اپنے مال کے بارے میں شریعت کے مطابق کوئی بھی فیصلہ کرتا ہے، یعنی کسی کو کچھ دیتا ہے اور کسی کو نہیں دیتا تو اسے اس کا اختیار ہے، اگرچہ مناسب تو یہی ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ زندگی میں بھی اپنی اولاد میں فرق نہیں کرنا چاہیے، بلک اُن کو برابر برابر دینا چاہیے۔

حکومت کوئی موت ٹیکس (Death Duty) مقرر نہیں کرسکتی

اگر کسی میت (مرد، عورت) کا کوئی وارث نہ ہو، تو ایسی صورت میں حکومت، اُس مال یا جائیداد کا وارث بن سکتی ہے، یعنی اس مردے کے ترکہ کا سارا مال قومی خزانہ میں جمع کیا جائے گا۔ جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ یہ اس لیے کہ اقرباء کی غیر موجودگی میں پھر سب سے زیادہ قریب حکومت اور قومی خزانہ ہے، جو اس شخص کی زندگی میں اس کے تمام اُمور کی دیکھ بال کرتی تھی، اس کو سیکورٹی فراہم کرتی تھی، اور اس شخص کی زندگی میں وہ تمام سہولیات بہم پہنچاتی تھی جو اس کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس کے مال کے سب سے پہلے حقدار تو اس کے اپنے نسبی رشتہ دار ہیں، لیکن نسبی رشتہ دار کی غیر موجودگی میں اب سب سے قریب بلکہ اقرب حکومت ہے، جو بقیہ مال سارا لے گی۔ لیکن ورثاء کی موجودگی میں حکومت میت کے ترکہ پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کرسکتی، اس لیے کہ یہ حصہ اللہ تعالیٰ نے نہیں مقرر کیا۔

تین چیزیں مانع میراث ہیں:　　۱- غلامی ۲- قتل ۳- اختلافِ دین

۱- غلامی: یہ اس لیے کہ چونکہ غلام خود اور اُس کی ملکیت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کا سب اُس کے آقا کا ہے، اس وجہ سے غلام نہ میراث لیتا ہے اور نہ اس کا مال میراث ہوتا ہے، کیونکہ اس کا جو کچھ بھی ہے وہ پورے کا پورا اِس کے آقا کا ہے، اور ظاہر بات ہے کہ آقا کا غلام کے ساتھ کوئی نسبی، یا سببی یا رضاعی رشتہ نہیں ہے، تو غلام کو اگر میراث میں حق مل جائے گا تو وہ پورے کا پورا آقا کے پاس جائے گا، اور وہ اس حق کا حق دار نہیں ہے، تو غلام کو میراث میں حق دینے سے میراث غیرِ وارث کے ہاتھ منتقل ہوجائے گا۔

۲- قتل: یعنی اگر کسی وارث نے اپنے مورث کو قتل کردیا تو اس قاتل کو مقتول کے ترکہ میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: القاتل لا یرث۔ (۲۱)

قاتل اس لیے میراث کے حق سے محروم ہوجاتا ہے کہ اگر اس کے میراث کے حق کو ساقط نہ کیا جائے، تو لوگ اپنے قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا شروع کردیں گے، اس لیے کہ مال کی محبت لوگوں کو اندھا اور بہرا بنادیتی ہے، اور پھر وہ اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں تک کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے، جیسے کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کے لیے بھائی نے بھائی کو، بھتیجے نے چچا کو، چچا نے بھتیجے کو، ماموں نے بھانجے کو اور بھانجے نے ماموں کو قتل کردیا ہے۔ اس کے نتیجے میں صلہ رحمی کا نام ونشان ہی مٹ جائے گا، امن وامان ختم ہوجائے گا، اور ہر شخص اپنے ورثاء سے خطرے میں رہے گا کہ کسی بھی وقت یہ مجھے قتل کرسکتے ہیں۔ اللہ کے اس قانون کو اگر غور سے دیکھا جائے تو خود بخود محسوس ہوگا، کہ یہ قانون دراصل انسانیت کے تحفظ کا قانون ہے، اگر یہ قانون نہ ہوتا تو ہر گھر اور خاندان کے اندر اپنے ہی ورثاء

سے لوگ بدگمان ہوتے اور یہ اعتماد اُٹھ جاتا کہ یہ لوگ میری حفاظت کریں گے، بلکہ یہ گمان غالب ہوتا کہ ان قریبی رشتہ داروں نے موقعہ پاتے ہی مجھے قتل کر دینا ہے۔اور پھر ہر ایک اپنے ورثاء کو قاتل کی نظر سے دیکھتا، کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ اس جیسے صورتحال میں انسانی زندگی کی کیا حالت ہوتی۔فالحمد لِلّٰہ علی نعمۃ الإسلام۔

۱۔ مرد کو عورت سے دُگنا حصہ ملے گا۔یہ صورت اس وقت ہوگی کہ میت کی اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں موجود ہوں۔

یہاں لوگ یہ سوال کرتے ہیں، کہ لڑکی کو کیوں لڑکے کا آدھا حصہ ملا ہے،اس کا فلسفہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔اس مضمون کے شروع میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ تقسیم میراث کا فلسفہ ضرورت بھی ہے کہ جس کی ضرورت زیادہ ہے اُس کو زیادہ حصہ دیا گیا ہے،اور جس کی ضرورت کم ہے اُس کو کم دیا گیا ہے۔چونکہ اللہ تعالیٰ نے مرد پر بہت ساری ذمہ داریاں رکھی ہیں، جو عورت پر نہیں رکھی گئی۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو عورت کے تمام اخراجات سمیت بچوں کے تمام اخراجات، اُن کی تعلیم، علاج، رہائش، حتی کہ رشتہ کے وقت مرد نے عورت کو مہر بھی ادا کرنا ہے جو عورت کا اپنا ہے اور کوئی اس میں اُس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو مالی ذمہ داریاں تمام کی تمام اللہ تعالیٰ نے مرد کے حوالے کی ہے،اور عورت کو نہ صرف یہ کہ کمانے کی کوئی ذمہ داری نہیں دی ہے بلکہ اُس کے اپنے اخراجات کا بوجھ بھی اُس پر نہیں رکھا،اور وہ بھی مرد کے حوالے کیا، یعنی عورت کے نان نفقہ، کپڑے، علاج، حسب طاقت رہائش اور دوسری سامانِ ضرورت کی ساری ذمہ داریاں مرد کے حوالے کی ہے، اگر چہ عورت خود مالدار کیوں نہ ہو۔اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ مرد کی ضرورتیں زیادہ ہے اور عورت کی ضرورتیں کم ہیں،اور جو کم ضرورتیں ہیں وہ بھی مرد کے حوالے ہیں۔ یہاں اگر کوئی اعتراض آ سکتا ہے تو وہ مرد کی طرف سے آنا چاہیے کہ اُس پر ذمہ داریاں زیادہ ڈالی گئیں ہیں اور حصہ کم دیا گیا ہے، جبکہ عورت پر ذمہ داریاں نہیں ڈالی گئیں بلکہ اُس کی اپنی ضرورتیں مرد کے حوالے کی گئیں اور حصہ زیادہ دیا گیا ہے۔

ایک مثال سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی، کہ مثلاً ایک شخص فوت ہو گیا اور اس کے ورثاء میں سے صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی رہ گئے، اور اس متوفّٰی نے مبلغ تین لاکھ روپے کا ترکہ چھوڑا، تو میراث کے قانون کے مطابق اس کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ لڑکے کو دو لاکھ روپے ملے گا اور لڑکی کو ایک لاکھ روپے ملے گا۔اب جب ان دونوں کے رشتے ہونے ہیں، تو لڑکے نے اپنی بیوی کو مثلاً کم از کم دو لاکھ روپے مہر ادا کر دیا، اور اس کے ساتھ شادی کے دوسرے اخراجات بھی اُس کو برداشت کرنے ہیں، جو مہر کی رقم سے کہیں زیادہ ہونگے، دوسری طرف اس لڑکی کے ساتھ جو شادی کرے گا تو وہ اس کو مثلاً دو لاکھ روپے ادا کرے گا، جو اس کی اپنی ملکیت ہوگی اور شادی کے اخراجات میں سے اس پر کوئی بوجھ بھی نہیں ہے۔ پھر دیکھیں تو لڑکا اپنی بیوی کے تمام مذکورہ اخراجات بھی برداشت کرے گا جبکہ اس لڑکی کے یہ اخراجات اس کے

ہونے والے شوہر کی ذمہ داری ہے۔غور کیا جائے تو یہاں مرد کا مال مسلسل کم ہوتا جارہا ہے،اور روزمرہ کے اخراجات بھی اُس کے ذمے ہیں،جبکہ عورت کا مال اپنی جگہ محفوظ ہے،جس سے شوہر کوئی مطالبہ نہیں کرسکتا،الا یہ کہ وہ خود برضا ورغبت شوہر کو اپنے حق مہر میں سے کچھ یا پورا معاف کردے،یا اپنے مال میں سے خود بہ طیب خاطر کچھ اُس کو دیدیں،بلکہ عورت کا مال بڑھ رہا ہے اب یہاں دیکھا جائے تو عورت کو مراعات ہی مراعات دی گئی ہیں جبکہ مرد کو ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔اب ہر ذی عقل اگر غور کرے تو یہاں عورت کو زیادہ سہولتیں اور مراعات دی گئی ہیں،جس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ لیتی ہے دیتی کچھ نہیں،فائدہ اُٹھاتی ہے لیکن نقصان سے بری الذمہ،اور اپنا مال ہمیشہ جمع کرتی ہے خرچ کچھ نہیں کرتی، نہ وہ مرد کے ساتھ تکالیف اور مشکلات میں شریک ہوتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میراث کی تقسیم کا فلسفہ سارے کا سارا عورت کے مفادات کے گرد گھوم رہا ہے،جبکہ عورت چیخ رہی ہے کہ مجھے آدھا حصہ دیا گیا ہے،اور مجھ پر ظلم کیا گیا ہے۔ یہ دراصل قرآن وسنت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

اب دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے جو تقسیم کی ہے،وہ کس طرح عدل اور باریک بینی پر مبنی ہے۔ظاہر بین نگاہیں جو بھی دیکھیں،لیکن یہاں تو عورت ہی کے مفاد کو اہمیت دی گئی ہے،اس سے اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم کی حکمت اور فلسفہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔فتدبر۔

۲- اگر میّت کے اولاد میں صرف دو یا زیادہ لڑکیاں ہوں تو ان سب کو (ثُلُثان) دوتہائی ملے گا جس کو وہ سب آپس میں برابر تقسیم کرینگی۔

دو بیٹیوں کو دوتہائی ملنے کا فلسفہ یہ ہے کہ چونکہ ایک بیٹی کو ایک بیٹے کے ساتھ ثُلُث ملتا ہے تو ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کے ساتھ بطریق اولیٰ ثُلُث ملے گا،کیونکہ بیٹے کا حصہ بیٹی سے زاید ہے تو جب بیٹے کی وجہ سے اس کا حصہ ثُلُث سے کم نہیں ہوا تو دوسری بیٹی کی وجہ سے کیسے کم ہوسکتا ہے؟

اس لیے دو بیٹیوں کا حکم تو بدیہی بات ہے،سوال اگر آسکتا تھا تو وہ دو سے زیادہ بیٹیوں کے حصے کے بارے میں آسکتا تھا تو اس کے لیے فرمایا کہ دو سے اوپر کے لیے بھی ثُلُثان کا حصہ ہوگا،اس سے زیادہ نہیں ہوگا۔

۳- اگر میّت کی صرف ایک بیٹی ہو تو اسکو تمام میراث کا نصف ملے گا۔یہ اس لیے کہ اولاد کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے،اور میراث کی تقسیم کا فلسفہ اسی ضرورت پر مبنی ہے،اور جب اولاد میں سے کوئی اور موجود نہیں ہے تو بیٹی جو اولاد میں میت کے سب سے زیادہ قریب ہے،اس لیے اس کو نصف بطور ذوی الفروض ملے گا،اور عصبہ کی غیر موجودگی میں بقیہ نصف بھی اس کو بطور عصبہ ملے گا۔

۴- اگر میّت کی اولاد بھی موجود ہو اور والدین بھی زندہ ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔یہ اس لیے کہ اگر باپ کو اس وقت ذوی الفروض میں حصہ نہ ملے،اور مال پورے کا پورا دوسرے ورثاء میں تقسیم ہو تو پھر والد کے

لیے کچھ بھی نہیں بچے گا۔ مثلاً ورثاء میں میت کے بیٹے بیٹیاں شامل ہیں، تو ذوی الفروض کے حصوں کے بعد بقیہ ترکہ پورے کا پورا (للذکر مثل حظ الأنثیین) کے قاعدے کے مطابق اولاد میں تقسیم ہو جائے گا اور باپ کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اور اصل کی طرف سے باپ سے زیادہ قریبی کوئی اور نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے حاجب بن سکے۔ تو اگر اُس کو ذوی الفروض میں حصہ نہ دیا جائے تو حاجب کی غیر موجودگی کے باوجود باپ محجوب ہو جائے گا۔ ہاں اولاد کی غیر موجودگی میں چونکہ باپ کے لیے یقیناً کافی حصہ بچ جاتا ہے، اس لیے میت کی اولاد نہ ہو تو اُس کے باپ کو ذوی الفروض میں حصہ نہیں ملے، اور بقیہ پورا ترکہ اُس کو بطور عصبہ ملے گا۔

۵- اگر میت کا باپ زندہ نہ ہو اور دادا زندہ ہو تو اس صورت میں باپ کا حصہ دادا کو ملے گا۔ یہ حصہ اُس کو اس لیے نہیں ملتا کہ وہ باپ کا قائم مقام ہے، بلکہ باپ کی غیر موجودگی میں دادا اقرب یعنی میت کے سب سے زیادہ قریب ہے اس لیے وہ باپ کا حصہ لے گا۔ قائمقامی کی تفصیل پوتے کی وراثت کی تفصیل میں آ گے آ رہی ہے۔

۶- اگر میّت کی کوئی اولاد نہ ہو تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا، اور اگر میت کے بہن بھائی موجود ہوں تو پھر ماں کو چھٹا حصہ ملے گا باقی پورا باپ کو ملے گا۔ یہاں میراث کے مسئلے کا ایک راز اور فلسفہ سمجھنے کی ضرورت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کے علیم اور لطیف خبیر ذات ہونے کا اچھی طرح پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں بہن بھائیوں کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوا لیکن بہن بھائیوں کو کچھ بھی نہ ملا۔ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ بھائی اور بہنوں کی وجہ سے جب ماں کا حصہ کم ہو گیا تو یہ حصہ پورا یا اس میں سے کچھ بھائیوں کو ضرور مل جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ ماں سے کم ہونے والا حصہ پورے کا پورا باپ کو منتقل کیا گیا، اور انسانی عقل بے مایہ حیران رہ گئی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم حکمت کارفرما ہے وہ یہ کہ یہاں ضرورت کو دیکھا گیا ہے، یعنی بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے ماں کا حصہ کم نہیں کیا گیا بلکہ بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے باپ کی ضرورت زیادہ ہونیکی وجہ سے ماں کے حصہ سے باپ کو منتقل کیا گیا کیونکہ میت کے ان بھائیوں کی پوری ذمہ داری باپ پر ہے، اُس نے ان کی شادیاں کرانی ہیں، ان کے نان نفقہ کی ذمہ داریاں باپ کے ذمے ہیں، ان کے معاش اور کاروبار وغیرہ شروع کرانے کی پوری ذمہ داری بھی انہی کے ذمہ ہے، جبکہ ماں کے ذمے ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لیے باپ کو ماں کی نسبت زیادہ حصہ دیا گیا ہے۔ میراث کے قانون میں صرف باپ ایسا وارث ہے کہ اس کو ذوی الفروض میں بھی حصہ ملتا ہے اور پھر ان سے بچا ہوا بھی بطور عصبہ لیتا ہے۔ باپ کے علاوہ جتنے بھی ذوی الفروض ہیں وہ جب ایک دفعہ بطور ذوی الفروض حصہ لے لیتے ہیں تو دوبارہ بطور عصبہ پھر حصہ نہیں لے سکتے۔

۷۔ اگر میت کی ایک بیٹی ہے تو اس کو کل ترکہ کا نصف ملے گا،لیکن اگر اس کی پوتی یا پوتیاں موجود ہوں تو ان کو چھٹا حصہ ملے گا، بشرطیکہ بیٹا اور پوتا نہ ہو۔ایک بیٹی کے ساتھ پوتی کو بھی چھٹا حصہ ملتا ہے کہ چونکہ بیٹیوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ ثلثین ہے، یعنی دو تہائی حصہ، تو جب بیٹی کو نصف حصہ مل گیا تو ثلثین میں چھٹا حصہ باقی ہے، اور اولاد میں دوسری بیٹی نہیں ہے تو پوتی اقرب ہے، جو یہ چھٹا حصہ لے گی تا کہ عورتوں کا دو تہائی کا حصہ مکمل ہو جائے ،اسی وجہ سے اس کو میراث کے قانون میں مسئلہ تکملۃ الثّلُثین کہتے ہیں۔اسی طرح یعنی اسی فلسفہ کے تحت اگر صرف پوتی موجود ہے تو وہ آدھا حصہ لے گی لیکن اگر پڑپوتی یا پڑپوتیاں موجود ہیں تو ان کو چھٹا حصہ ملے گا، بشرطیکہ بیٹا، بیٹی، پوتا اور پڑپوتا موجود نہ ہو۔

۸۔ بیوی کے مال میں شوہر کا آدھا حصہ ہے اگر بیوی کی اولاد نہ ہو۔اگر بیوی کی اولاد ہو، خواہ وہ اولا د اس موجودہ شوہر سے ہو یا اس سے پہلے والے شوہر سے ہو، تو شوہر کے لیے چوتھا حصہ ہے۔شوہر (میّت) کے مال میں بیوی کا چوتھا حصہ ہے بشرطیکہ شوہر کی اولاد نہ ہو، اور اگر شوہر کی اولاد ہو، خواہ اس بیوی سے ہو یا دوسری بیوی سے، تو پھر بیوی کا آٹھواں حصہ ہے۔ ہاں! اگر شوہر نے اپنی بیوی کو مہر ادا نہیں کیا تھا تو وہ قرض میں داخل ہے۔

یہاں اس تقسیم میں شوہر اور بیوی دونوں کو جو حصہ دیا گیا ہے، اس میں بھی ضرورت کا فلسفہ کارفرما ہے، کہ چونکہ مرد کی ضرورت زیادہ ہے، اور عورت کی ضرورت کم ہے تو یہاں بھی دیکھا جائے تو مرد، یعنی شوہر کو نصف اور چوتھائی، جبکہ عورت کو چوتھائی اور آٹھواں حصہ دیا گیا ہے، یہاں بھی للذکر مثل حظ الأنثيين کے اُصول کے مطابق تقسیم کیا گیا ہے۔

۹۔ اگر میت کی اولاد، باپ، دادا میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو پھر حقیقی بہن کی باری آتی ہے، دو یا زیادہ بہنوں کو ثلثان اور ایک کو آدھا ملے گا۔ بشرطیکہ حقیقی بھائی نہ ہو۔ یہ اس لیے کہ اب یہ حقیقی بہن میت کے سب سے زیادہ قریب ہے، اور اگر اولاد، باپ، دادا اور حقیقی بھائی، بہن موجود نہ ہوں تو پھر علاتی بہن کو اسی ترتیب سے حصہ ملے گا، جس ترتیب سے حقیقی بہن کو ملا تھا، بشرطیکہ علاتی بھائی نہ ہو۔ کیونکہ نسب کے لحاظ سے اب وہ میت کے اقرب ہے۔

☆ میاں بیوی کو سببی ذوی الفروض کہتے ہیں اس لیے کہ ان کا حصہ نکاح کے سبب سے ہے اور باقی کو نسبی ذوی الفروض کہا جاتا ہے۔

☆ اس فرق کا اثر یہ ہے کہ جب ذوی الفروض سے بچے ہوئے ترکہ کے لینے کے لیے عصبات میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو وہ مال صرف نسبی ذوی الفروض میں واپس دوبارہ تقسیم کیا جائے گا، سببی کو اس میں سے کچھ نہیں ملے گا۔

☆ ورثاء کے جتنے حصے ہیں، نصف، ثلث وغیرہ، تو یہ مردے پر موجود قرض اور وصیت پر عمل کے بعد بچے ہوئے مال میں ہے نہ کہ پورے مال میں۔

قرض وصیت پر مقدم ہے!

یہ اس لیے کہ چونکہ قرض میت پر موت سے پہلے تھا اور اس کا ادا کرنا فرض ہے، اور اس فرض کا مطالبہ بھی موجود ہے کہ قرض خواہ اس کو مانگ رہا ہے۔ جبکہ وصیت ایک عطیہ ہے، نہ کہ فرض۔ اور دوسری بات یہ کہ یہ وصیت مردے نے اپنے مال سے دینے کی کی ہے، تو اب اُس کا مال اگر بچا ہی نہیں تو وصیت خود بخود باطل ہو جائے گی، اور وصیت باطل کیوں نہ ہوگی، جب قرض کی ادائیگی میں سارا مال ختم ہو جاتا ہے تو ورثاء بھی محروم ہو جاتے ہیں، تو موصی لھم کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، کہ وہ اپنے لیے ہونے والی وصیت کا مطالبہ کریں۔ اس لیے قرض کو مقدم رکھا گیا ہے اور وصیت اس کے بعد ہے، کیونکہ اگر وصیت کو پہلے پورا کیا جائے گا تو پھر قرض داروں کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا، اور نفل کو فرض پر مقدم کیا جائے گا، جو کسی صورت جائز نہیں ہے، اس کے بعد بقیہ ترکہ کو ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم کو کوئی بھی کام حکمت ارو فلسفہ سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے اسکے احکام بھی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا کسی انسان کے سمجھ میں آنا یا نہ آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اللہ کے فیصلوں اور قوانین کی کوئی حکمت نہیں۔ بات اس حکمت کو سمجھنے کی ہوتی ہے۔

پوتے کی وراثت کا مسئلہ اور اس کی حکمتیں

حق وراثت موت کے بعد ثابت ہوتا ہے نہ کہ موت سے پہلے، اس اُصول کی رو سے میراث میں صرف اُن لوگوں کا حصہ ہوگا جو مورث کی وفات کے وقت زندہ ہوں۔

دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ حق میراث قرب اور بعد کی بنیاد پر ہوتا ہے جیسے قرآن نے فرمایا: "مما ترك الوالدان والأقربون" تو الأقرب فالأقرب حقدار ہوگا اور بعید تر محروم ہوگا۔ پوتے کی وراثت کے بارے میں معترضین کی دلیل یہ ہے کہ جیسے باپ کی غیر موجودگی میں دادا وارث ہوتا ہے تو اسی طرح بیٹے کی غیر موجودگی میں پوتا اس کے قائم مقام کی حیثیت سے وارث ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض باطل ہے، اس لیے کہ یہ تب صحیح ہوتا کہ جب ایک آدمی بیک وقت تین، چار آدمیوں کا بیٹا ہوتا اور ان میں سے ایک کے مرجانے سے دادا کو حصہ پہنچتا۔ یا پھر ایک آدمی کی زندگی میں اس کی ساری اولاد فوت ہو جانے پر اس کے پوتوں کو حصہ نہ ملتا۔

میراث میں قائم مقامی (Representation) نہیں بلکہ قرب و بعد کا اعتبار ہے، تو اگر مردہ کی براہ راست اولاد موجود ہے تو بالواسطہ اولاد کو حصہ نہیں ملے گا۔

اگر قائم مقامی کے اصول کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے میراث کا پورا قانون پراگندہ اور غیر معقول بن جائے گا۔ مثلاً:

اگر ایک شخص کے دو بیٹے تھے اور وہ اس کی زندگی میں فوت ہو گئے، ان میں سے ایک کا صرف ایک بچہ تھا اور دوسرے کے چار۔قرآنی قانون کے رو سے ان کا برابر حصہ ہے جبکہ قائمقامی کے قانون میں چونکہ یہ اپنے اپنے باپ کا حصہ لیتے ہیں اس لیے پورے ترکہ سے آدھا حصہ ایک کو ملے گا اور آدھا حصہ چاروں کو ملے گا۔اسی طرح اگر قائمقامی کا اصول صحیح مان لیا جائے تو پھر ہر کسی کو قائمقامی کا حق ملنا ضروری ہے جیسے، ساس، سسر، سالے، مرے ہوئے چھوٹے بچوں کی ماں، یہ سب پھر کیوں قائم مقامی کے حق سے محروم ہونگے؟

اگر تمام مرے ہوئے لوگوں کے بچے یا دوسرے رشتہ دار اپنے اپنے متوفّی رشتہ دار کے قائمقام بن جائیں گے تو موجودہ براہ راست ورثاء کو کیا ملے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ پوتا اپنے باپ کا وارث ہے نہ کہ دادا کا، ورنہ پھر زندہ بیٹوں کے بیٹے کیوں محروم ہیں؟ یعنی اگر ایک پوتا حصہ لیتا ہے، تو دوسرے پوتے کیوں محروم ہیں، باپ کا ہونا اور نہ ہونا تو الگ بات ہے، پوتا ہونے میں تو وہ سب اس کے ساتھ شریک ہیں، تو اُن کو کیوں حصہ نہیں ملتا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک استثنائی صورت ہے، جس کا حل شریعت نے وصیت کی صورت میں نکالی ہے۔ ہر بیٹا اپنے باپ کے ترکہ کا وارث ہے اور وہ ایک ہی دفعہ ہو سکتا ہے کیونکہ باپ ایک ہوتا ہے، اس لیے جب اس پوتے کا اپنا باپ مرا تھا تو یہ اس کا وارث تھا اب دوسری دفعہ یہ اسی طرح دادا کے ترکہ سے باپ کے حصے کا وارث کیسے بن سکتا ہے؟

جو لوگ پوتے کی وراثت میں یتامیٰ کا نام لے کر جذباتی قسم کی اپیلیں کرتے ہیں انہیں اس پوتے کے بیوہ ماں پر کیوں رحم نہیں آتا۔

یہی لوگ لاولد بیٹوں کی بیویوں کی میراث کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟

جن قوموں میں پوتا سرے سے ہوتا ہی نہیں وہ کیسے اعتراض کر سکتے ہیں، کہ پوتے کو حصہ کیوں نہیں دیا گیا؟

اگر کسی خاندان میں خصوصا جہاں Joint family system ہوتا ہے، کسی باپ کے پاس وفات کے وقت کچھ بھی نہیں تھا، بلکہ سارا مال دادا کی ملکیت تھا تو ایسے ہی پوتے/ پوتوں کے لیے وہ اپنے مال کے ایک تہائی حصے کی وصیت کر سکتا ہے۔

☆ اسی طرح معاشرے میں بے شمار لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مر جاتے ہیں لیکن ان کا کوئی مال نہیں ہوتا، اور ان کے بچوں کے لیے ترکہ میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

مراجع وحواشی

(۱) ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی۔سنن ابن ماجہ۔ج۴۔ص۲۳

(۲) القرآن۔سورۃ البقرہ:۱۸۳

(۳) ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم القشیر ی۔الجامع الصحیح مسلم۔تحقیق محمد فؤ ادعبد الباقی۔ بیروت: دار احیاء التراث العربی۔ج۲۔ص۴۹۳

(۴) القرآن۔سورۃ النساء:۱۱،۱۲

(۵) القرآن۔سورۃ النساء:۱۷۶

(۶) القرآن۔سورۃ النساء:۷

(۷) ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی۔(۳۰۳ھ)۔السنن الکبریٰ۔تحقیق حسن عبدالمنعم۔ج۶۔ص۹۷

(۸) ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی۔السنن الکبریٰ۔ج۶۔ص۲۰۸

(۹) ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی۔(۱۴۰۴ھ)۔سنن الدارمی۔فیصل آباد: حدیث اکادمی۔ج۲۔ص۲۴۷

(۱۰) ایضاً

(۱۱) ابوبکر عبداللہ بن محمد ابن ابی شیبہ العبسی۔مصنف بن ابی شیبہ۔ج۱۱۔ص۲۳۴

(۱۲) ایضاً

(۱۳) سعید بن منصور الخراسانی۔سنن سعید بن منصور۔بیروت: دارلکتب العلمیۃ۔ج۱۔ص۹۶

(۱۴) ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم القشیر ی۔الجامع الصحیح مسلم۔بیروت: دارالجیل۔ج۲۔ص۲۰۱

(۱۵) ابوبکر عبداللہ بن محمد ابن ابی شیبہ العبسی۔ص۲۳۵

(۱۶) ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی۔ص۲۰۹

(۱۷) القرآن۔سورۃ الحشر:۶

(۱۸) ابوالاعلیٰ مودودی۔تفہیم القرآن۔ایڈیشن۵۔ج۵۔حاشیہ نمبر۱۴۔لاہور: ادارہ ترجمان القرآن۔ص۳۹۳

(۱۹) ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی۔سنن ابن ماجہ۔کتاب الجنائز۔ج۲۔ص۵۳۷

(۲۰) سلیمان بن اشعث ابوداؤد السجستانی۔سنن ابی داؤد۔باب ماجاء فی الوصیۃ للوارث۔ج۲۔ص۱۲۷

(۲۱) ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی۔سنن ابن ماجہ۔تحقیق محمد فؤ ادعبد الباقی۔باب میراث القاتل۔ج۲۔ص۹۱۳